راجیندر منچندا بانی کی غزل میں فکری تنوع : تحقیق و تجزیہ

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل [1]م ڈاکٹریاسمین سلطانہ **

Abstract:

"This article is a serious, yet pleasant academic endeavor to critically evaluate and appreciate and notable Urdu poet, Manchanda Bani. Born in Multan, Bani was forced to leave the land of ancestral in the after match of partition and bloodshed that followed like millions of Hindus, Muslims and Sikhs on both sides of the border. The Hindus of migration, undoubtedly cast a deep shadow on the poetry of Bani, like most of his counterparties, who were forced and undergo the pains and rigorous of this human tragedy. On a positive note however, this article lucidly throws light on the poetic artistry and craft of this illustrations and modern poet beyond the more popular, though tragic, shades of partitions enigma. Thus, the Urdu reader is able to rediscover the strong and articulate poet within Rajendra ManchandaBani. Late Bani is a unique figure in modern Urdu poetry. Though much ignored by literary establishment, Bani nevertheless has come to be known as a distinct voice in post-independence period. Rajendra Manchanda Bani was a refugee from Multan, now in Pakistan. Bani spent his short life in Delhi but he could never get over the loss of his ancestral home. For his creative expression, Bani (his pen name), chose Ghazal though he has also written Nazms too. In his Ghazals, Bani has used innovative ideas, expressions and meters to get the reader come to the level of the poet and feel the pangs of upheaval created by the great tragedy that 1947 represents for millions of people across South Asia. In the present article, an effort has been made to give the discerning reader a feel of the poet's oeuvre and his distinctive status within the annals of Urdu literature."

کلیدی الفاظ: ملتان، دہلی، ہجرت، غزل گوئی، قادر الکلامی، استعاراتی نظام، علامتی نظام، پیکر تراشی، تمثال کاری، نفسیاتی عناصر، موضوعاتی تنوع، نُدرت، جدّت، مضمون آفرینی، معنی آفرینی، ہجرت کے تجربات کا اظہار، تہ داری۔

راجیندر منچندا (۱۲، نومبر ۱۹۳۲ ء ملتان ۔ اکتوبر ۱۹۸۱ ء دہلی)، بانی تخلص کیا اور بھر پور انداز سےنئی غزل کہی اور اُن کی فکر سے نئی تراکیب اور نئے مضامین پھوٹے اور اُنھوں نے اُردو شاعری کے دامن کو وسعت بخشی۔ بانی نے اقتصادیات میں ایم اے کیا ۔ ملتان سے ۱۹۴۷ء میں ہجرت کرکے دہلی چلے گئے تھے۔دہلی میں ۳۹ سال کی عمر میں اُن کا دیہانت ہوا۔اُنھوں نے غزل کو اپنے ما فی الضمیر کے لیے وسیلۂ اظہار کے طور سے اپنایا اور غزل ایسی صنف میں اپنی الگ سے پہچان بنائی۔اُن کے مضامین میں نُدرت ہے، متخیّلہ میں انفرادیت کا احساس ہوتا ہے، اُنھوں نے نئی تراکیب تراش کر اپنی انفرادیت کا ثبوت فراہم کیا۔اُن کی غزل تازہ کاری کی عمدہ مثال ہے۔ اُنھوں نے بحور کا

---

[1]اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، ڈویژن آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، لوئر مال کیمپس، لاہور
** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی

استعمال بھی روایتی انداز سے ہٹ کر کیا ہے۔ اُن کے اُسلوب میں بھی نادرہ کاری کا احساس ہوتا ہے اور اُن کے کلام کی تاثیر بھی دل میں اُترتے کی طاقت اور توانائی سے مملو ہے۔

اُردوادب کے ممتاز نقاد اور محقق ڈاکٹرگوپی چندنارنگ نے بانی کے تعارف کے ضمن میں لکھا ہے:

'' کسےمعلوم تھا کہ نئی غزل کا طرح دار اورتازہ گوشاعر بانی اتنی جلدی موت کی آغوش میں چلاجائے گا۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء کی شب میں دہلی کے ہولی فیملی ہسپتال میں بانی نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اب جب کہ بانی اس دنیا میں نہیں ہے ،چندسوانحی شخصی حقائق کو محفوظ کردنیا ضروری معلوم ہوتا ہے، بانی کاپورا نام، راجیندرمنچندا تھا۔ وہ نومبر ۱۹۳۲ء میں ملتان میں پیداہوئے اور ان لوگوں میں سے تھے جنھیں تقسیم کی موج بہاکردہلی لے آئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ دہلی کی ادبی، ثقافتی زندگی کے طوفان اور تہلکوں اور ولولہ خیزیونمیں بانی خوب خوب شریک رہے۔ چوڑاناک نقشہ، کھلتاہوا رنگ، گٹھاہواکسرتی بدن، آج سے چند برس پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا باصحت تنومندنوجوان دیکھتے ہی دیکھتے گھل گھل کر اپنی اصل کے نقش موہوم میں نہیں رہ جائے گا، اورعین اس وقت جب اس کی غزل کی تازگی اور طرح داری باب پر ہوگی، موت کی پرچھائیں اس کو گھیرلے گی۔ بانی نے ایم۔ اے، معاشیات میں کیا تھا اورجب تک صحت نے ساتھ دیا، وہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں برداری کے ایک معمولی اسکول میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ کئی برس سے گٹھیا اور گردوں کی شدید تکلیف کی وجہ سے وہ رخصت پر تھے اور انتقال کے وقت اُن کی عمر انچاس برس سے زیادہ ہوگی۔ اگرچہ مرض انتہائی تکلیف دہ اوراذیت ناک تھا اور کیسا کیسادکھ بانی نے نہ اُٹھایا ہوگا، موت کا لرزتا ہوا، بھیانک سایہ، دوستوں کی بے التفاتی، اپنوں اور بیگانوں کی بے توجہی، چھوٹے چھوٹے بچے، سہارے معدوم، اُٹھنا بیٹھنا،کھانا پینا، جاگنا سب خواب وخیال۔ کون سا دکھ ہے جس کا سامنابانی نے نہ کیا ہوگا، لیکن حرف شکایت کبھی زبان پر نہ آیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ نئی غزل کی کیسی کیسی ممتاز شخصیتیں کم عمر میں جدا ہوگئیں۔''(۱)

منفرد تاثیر اور اُسلوب کا حامل شاعر راجیندرمنچندا بانی کانام ذہن میں گونجتے ہی جس شدت سے ایک احساس دل میں جاگزیں ہونے لگتاہے، وہ بانی کی انتہا درجے کی حساسیت، تازہ کاری اور تخلیقی انفرادیت ہے ۔ ایک بالکل مختلف لہجے کا شاعر جو اپنے ہم عصروں میں اپنی بعض طبعی خصوصیات کے ساتھ ممتاز نہ ہوسکا مگر اُردو غزل میں اپنی انفرادیت اور تازہ کاری سے اُس نے بالغ نظر نقادوں کو چونکا یابھی اور حیرت سے بھی ہم کنار کیا۔ہر عہد کا ردِعمل اتنا نمایاں اور دیرپانہیں ہوتا ، جتنا شدتِ احساس اور فکری امتیاز کے ساتھ مستقل بنیادوں پر خود کو منوالینے کا عمل نمایاں ، بھرپور اور جان دارہوسکتاہے۔ بانی میں یہ دونوں خصوصیات نمایاں سطح پر ہیں،یہی وجہ ہے کہ صرف بھارت ہی میں نہینبلکہ جہاں جہاں اردو شاعری کو سنجیدہ معیار کے ساتھ پڑھاجاتاہے، وہاں وہاں اپنی شعری ایمائیت اورفکری صلابت کے ساتھ دلوں میں گھر کرتا چلا گیا۔ تاہم یہ ایک عجیب اورپیچیدہ مسئلہ ہے، یہاں تک کہ انسانی طبیعتوں کا تقاضا بھی ہے کہ ہم عصریت ہمیشہ باہمی چشمک بلکہ چپقلش کو جنم دیتی رہی ہے۔ معدودے چند تخلیق کار ہی اپنے معاصرین کا اعتراف کھلے دل سے کرتے ہیں۔ بانی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بھارت ہو یا پاکستان، جہاں کہیں بھی بانی کے شعری مقام ومرتبہ اوراُن کی تخلیقی صلاحیتوں کے اعتراف میں کچھ لکھا گیا، بعض کے لیے دلی ملال کا باعث ہوا۔ اُردو کے ایسے تخلیق کار بھی ہیں جو بانی کی شاعری کوتاثیربیان سے عاری قرار دیتے ہیں اور بعض ایسے بھی شاعر ہیں جو بانی کو جناب ظفر اقبال تخلیقی وفور اور اُسلوب کا تسلسل قرار دیتے ہیں، ہمارا اپنا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بانی کی غزل میں امیجز جناب ظفر اقبال سے کسبِ فیض کا نتیجہ ہیں۔ظاہر ہے کہ اخذ و استفادہ ایک مثبت عمل ہے، وہ اس طرح کہ بانی نے اپنی گہری چھاپ قائم کی ہے۔ بانی نے اپنی غزل میں جو امیجز تخلیق کیے ہیں، اُن پر دستخط تو بانی کے اپنے ہی ہیں جو نہ صرف اُن کی انفرادیت اور جُدا

گانہ فکر کا پتا دیتے ہیں بلکہ اُن کی اپنی الگ سے پہچان کا بھی اعلان کرتے ہیں۔ ادب میں نقطۂ نظر کا ہونا ایک خوش آیند رویہ ہے جس سے تخلیقی عمل نہ صرف آگے بڑھتا ہے بلکہ اُس میں تازگی اور نُدرت کی تخلیقی صورتِ حال بھی سامنے آتی ہے۔

بانی کی غزل اپنے تخلیقی تنوع کے اعتبار سے جس اجمال وایجاز کی اعلیٰ خوبیوں سے اپنے ہم عصروں میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے، اس سے حظ اُٹھانے کے لیے پڑھنے والے کا ادراک بھی اسی اجمال وایجاز کا تقاضا کرتاہے۔ بانی کے ہاں شدتِ احساس کے ساتھ تاثیرِاظہار بھی اُن کے شاعرانہ مشاہدے کی دین ہی نہیں، تجربات وحوادث نے بھی اُن کے مذکورہ تخلیقی عمل کو دُوناکیاہے۔

اُن کے یہاں ہجرت کے تجربات اورمسافرت کے جو کھم اُٹھانے کا تخلیقی انداز چونکانے سے کہیں زیادہ شدتِ احساس سے آشنا کروانے کی تاثیر سے بھر پور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے روایتی لفظیات کو بالکل جداگانہ ڈھنگ اورندرت وجدت سے ہم کنار کیا ہے۔ زندگی کے تجربات میں ہجرت اور نقل مکانی کا دُکھوں سے تعبیر ہونا ایک روز روشن کی طرح عیاں حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو اُردو کے افسانہ نگاروں اورناول نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں جلوہ گر کیاہے اور ہجرت کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کو جو کُلفتیں اُٹھانا پڑیں ،اُن کو اپنے اپنے انداز سے آئینہ کرکے دکھایا ہے مگر شاعروں نے ہجرت، بے خانگی، بے سروسامانی ، بے یار ومددگاری، اپنوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑنے اوراپنے اُس قریہ ودیار، جس سے اُن کے بچپن کی اَن مِٹ یادیں وابستہ ہیں، اُن کو خلّاقانہ اُپج کے ساتھ اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔اُنھوں نے اپنی جنم بھومی ملتان کی مٹّی سے والہانہ وابستگی اور اُنس کو بھی اپنے تخلیقی اظہار کا حصہ بنایا ہے اور پھر یہ کہ جہاں اُن کا بچپن گزرا تھا، اُس مٹّی کو وہ کیسے بھول سکتے تھے! اور اُس دیار کو اپنے ذہن و فکر اور دل سے کیسے نکال سکتے تھے! ملتان جہاں اُنھوں نے جس سے ان کے کے بچپن کی اَن مٹ یادیں جڑی ہوئی ہیں، اُن کو تخلیقی پیرائے مینبچپن کے نہ صرف دن گزارے بلکہ اس مٹی سے اُن کا اُنس وعقیدت ایک انسانی نفسیاتی عمل بھی ہے، جب اُنھیں پندرہ برس کی عمر مینملتان سے ہجرت کرکے دہلی یعنی اُس پارجانا پڑا تو اُن کے اندر موجود تخلیق نے اپنے ’نا سٹیلجیا کو کبھی یادوں سے محونہیں ہونے دیا، اُن کایہ دُکھ مرتے دم تک اُن کے ذہن وفکر اور قلب و نظر کا حصہ رہا، جس کا اظہار تخلیقی پیرائے میں اُن کی شاعری میں جلوہ گرہی نہیں ہوا بلکہ وہ اپنی اُس ناقابلِ بیان دُکھ کی کیفیت اورمحسوسات کوتخلیقی صورت میں شعر کے پیراہن میں منظرِعام پربھی لاتے ہیں۔ اس دُکھ کی شدت کواُن کا حساس قاری نہ صرف محسوس کرسکتاہے بلکہ وہ قاری جو ہجرت کے تجربے سے نہیں گزرا، وہ بھی ہجرت کی کیفیات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے دُکھوں کو پورے کرب سے محسوس کر سکتا ہے۔ ایک ایسا تجربہ جس سے لاکھوں انسان گزرے، اس تجربے کی بھرپور شدت اور اس تجربے کو تخلیقی پیرائےمیں بیان کرنے کا ہنر بانی کے یہاں شدومد کے ساتھ محسوس کیاجاسکتاہے۔ انھوں نے استعاراتی پیرائے میں اس ہجرت کے تجربے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیاہے، جسے ۱۹۴۷ء کی تقسیم یا بٹوارے سے موسوم کیاجاتاہے۔ شاعر ی میں ایسے انسانی اجتماعی کرب اور ٹریجڈی کوخلق کرنے کا ہنرٹی۔ ایس ایلیٹ کی شاہکار نظمWaste Land میں عظیم اقتصادی بحران کی صورت میں جلوہ گرہوا ہے، جب پہلی جنگ عظیم۱۹۱۴ء اور دوسری جنگ عظیم۱۹۳۹ء نے لاکھوں انسانوں کو نہ صرف لقمہ اجل بنایا بلکہ انسانوں ہی کی حرص وہوس کو دکھانے کے ساتھ ساتھ استعماری قوتوں کے جبریت کوبھی آئینہ کیاہے اوراس کے ساتھ ساتھ زندہ بچنے والے انسان جس عظیم تاریخی المیے سے دو چارہوئے، اس کی بھی عکاسی مذکورہ نظم میں دیکھی اورمحسوس کی جاسکتی ہے۔ کم وبیش اسی طرح کی کیفیات اور محسوسات بانی کے مختلف شعروں میں بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں:

وہ لوگ جو کبھی باہر نہ گھرسے جھانکتے تھے
یہ شب اُنھیں بھی سررہ گزارلے آئی
اب ہے بانی فضا فضا محروم

گونجتا ہے مکاں مکاں خالی
ہمیں لپکتی ہوا پر سوار لے آئی
کوئی تو موج تھی، دریا کے پار لے آئی
خاک میں خوشبو نہ تھی، گلیوں میں جگنو نہ تھے
خالی و تنہا تھے ہم، شہر عذابوں کا تھا
یہ رات گزرے تودیکھوں طرف طرف کیا ہے
ابھی تو میرے لیے سب کچھ آسمان میں ہے
عجیب نظارا تھا بستی کے اُس کنارے پر
سبھی بچھڑ گئے دریا سے پار اُترتے ہوئے
نہ جانے کیا لوگ بچھڑے ہوں گے
وہ موڑ سنسان کس قدر تھا
عکس کوئی کسی منظر میں نہ تھا
کوئی بھی چہرہ کسی در میں نہ تھا
میں ایک حادثہ بن کر کھڑا تھا رستے میں
عجب زمانے مرے سر سے تھے گزرتے ہوئے
فصیلِ شب سے عجب جھانکتے ہوئے
کرن کرن کے پیاسے ہوا ہوا سے ہیں

گھروں سے باہر جنھوں نے کبھی جھانکا بھی نہ تھا ، اُن کو بھی ہجرت کے تجربے سے یا ناگہانی اوربے وقت موت کے تجربے سے گزرنا پڑا اورکچھ اس خوف سے اِدھر سے جاہی نہ سکے کہ عرصہ دراز تک رشتوں میں بھی تودراڑیں پڑ چکی تھیں۔ بانی کی مصرعہ سازی، تلازمات، ترکیبی نظام ، ڈکشن اور لفظیات کے برتنے کا ہنر سب کچھ تو انھیں الگ شناخت کا حامل شاعر ٹھہراتا ہے۔ معنوی سطح پر تازگی وتازہ کاری اور اُسلوب کی سطح پر ندرتِ زبان وبیاں، ذات سے لے کر کائنات تک ایک ہی بندھن میں بندھے نظر آتے ہیں۔ بانی کی غزل اپنی الگ کائنات کاپتا دیتی ہے۔ شاعری کے ہجوم سے بانی کے ایک مصرعے کوپڑھ کر بتایا جاسکتاہے کہ یہ طرزِ احساس اور طرزِ اظہار صرف اور صرف بانی کا ہے، کسی اور کانہیں۔ اس حوالے سے بانی کا ترکیبی اور استعاراتی نظام خالصتاً اُس کا اپنا دکھائی دیتا ہے اورایک خاص ندرت کا حامل ہے۔ معروف نقاد ڈاکٹرگوپی چندنارنگ نے بانی کے شعری اجزائے ترکیبی پرجوبات کی ہے، ذرادیکھیے:

> ''بانی کے فن کا ایک خاص پہلو اُن کی خوش ترکیبی ہے۔ ان کا شعری وجدان نئے معنی اور نئے مفاہیم کا ساتھ دینے کے لیے نئی ترکیبوں اورنئے مرکبات کو برابر تراشتا رہتا ہے:، مثلاً صدحسابِ آرزو، محرابِ ہوا، مفہوم فرواں ، بابِ تصور، بوسۂ بے ساختہ ،رمزآشنائے تجسس، شمع شکایت، لمحۂ کم مہرباں، لمحۂ خندہ حواس ،لمحۂ لرزاں، لمحۂ بے وقت، لمحۂ خالی، لمحۂ رایگاں، نشاطِ نفع ، موجِ امکانی ، بے گانۂ نفع وضرر طلسم کاری آغازِداستاں، طلسم خانۂ رنگ، منظر بے چہرگی، قربِ سرد، حرفِ تہی اسم ،عکس منتشر، ہلاکِ ہوا، خیمۂ گردِ سفر، سیاہ خانۂ امید رایگاں ، حس جسم وجاں، رنگ زار، عدم تاثیر لہجہ، خوش تعاون ،سمت پسندی، وفا قائم، کپاسی برف، شب شکن، زودقائل ، برابر قدم دوست، خوش تعمیری۔''(۳)

یہ ترکیبی نظام بانی کی منفردفکر سے پھوٹتا ہے اور لفظی خوش آہنگی کے ساتھ قاری پر صرف خوب صورت تاثرہی پیدا نہیں کرتا بلکہ بانی کی تخلیقی قوت اورمشاہدہ ٔفکر کے شان دار ترفع کی نمائندگی بھی کرتاہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بانی کی ''خوش ترکیبی'' کے عمل کو نئے معانی اوراُس کے نئے شعری وجدان کے طورپر دیکھا ہے اور میں سمجھتاہوں کہ یہ ''خوش ترکیبی'' بانی کے ہاں وہاں بھی موجود ہے، جہاں اس نے پرانے اور سامنے کے تجربات کوپیش کیا ہے مگر اس کی

ذاتی کیفیت میں ڈھلتے ہوئے از خود اُس کے نئے ترکیباتی عمل میں شامل ہوجاتے ہیں۔ ہجرت کے تجربے کو بانی کے ہاں ایک خاص اہمیت حاصل ہے اوریہ اہمیت جس تناظر سے پھوٹتی ہے، وہ مہاجرت کا تناظر ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے ادب میں جو کچھ موجود ہے، وہ ہجرت اب عام تجربے کے طور ہماری مانوسیت کا باعث بن چکی ہیں، مگر بانی جیسا شاعر اسے جس زاویے سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے ، وہ تجربہ کہیں اور اتنے گہرے شاعرانہ کرب کے ساتھ دکھائی نہیں دیتا۔ تقسیم کے وقت سفر تو سب نے کیا، کسی نے یہاں سے اُدھر اور کسی نے اُدھر سے یہاں، مگر بانی کے ہاں سفر کی کیفیت میں جس سطح پر اس کی کرب ناک جزئیات اُتر آئی ہیں، وہ بانی کی انفرادیت پردلالت کرتی ہیں ۔
شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''بانی کی غزل میں ہجرتاپنی قیامت خیزی اور کرب ناکی کے ساتھ جلوہ گری ہوئی ہے، لیکن بانی کی غزل میں مذکورہ ہجرت کی تمام صورتِ حال نے رجائیت کو تخلیق کیا ہے نہ کہزندگی سے کنارہ کشی کی صورتِ حال پیدا کی ہے، کئی لحاظ سے اُداسی کی فضا ضرور پیدا ہوئی ہے۔ ''(۴)

ہجرت ایک مثبت پیش رفت کی طرح ابھرتی ہے کہ جس کے دامن میں اچھے دنوں کی آس، گزرے ایّام کییاد کے ساتھ مل کر عجب سماں باندھتی ہے۔
ایک الگ احساس، ایک الگ پیرایۂ اظہار اور اشیا اورمظاہر کو دیکھنے کا مختلف عمل ،بانی کی شعری خصوصیات کامنفرد منظرنامہ پیش کرتا ہے ۔مثلاً :

سب کو سفر وسمت پسندی کا دے مژدہ
اب گھاٹ کی سب کشتیاں چلنے کی خبر دے
قدم زمیں پہ نہ تھے راہ ہم بدلتے کیا
ہوا بندھی تھی یہاں پیٹھ پر سنبھلتے کیا
راستے میں کوئی دیوار بھی تھی
وہ اسی ڈر سے نہ گھر سے نکلا
کوئی بھولی ہوئی شے طاقِ ہر منظر پہ رکھی تھی
ستارے چھت پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی

منچندا بانی نے رات کو اپنے مخصوص علامتی واستعاراتی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ یہ رات بانی کے ہاں تقسیم کے وقت کاپورا الم ناک منظر لے کر سامنے آتی ہے۔ وہ رات جب غیر منقسم ہندوستان کا بٹوارہ ہوااورلاکھوں انسانوں کو ہجرت، بے خانگی، بے سروسامانی کے سانحے سے گزرنا پڑا۔ وہ لوگ بھی اس عظیم کرب سے دو چار ہوئے، جن کے وہم وگمان میں بھی شاید ایساکچھ نہ تھا۔ بانی کے محولہ بالا اشعار میں ایک ایسا کرب ہے جوبیان کرنے سے زیادہ محسوس کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بانی نے ایک ایسے تجربے کو خلق کیا ہے ، جس سے نہ صرف وہ اوراُس کا خاندان گزرا بلکہ اُدھر سے اِدھر اور اِدھر سے اُدھر ہجرت کرنے والوں کاعظیم تاریخی ،تہذیبی و ثقافتی اور اقتصادی کرب شاعر کے ہاں شدتِ احساس کے ساتھ اس انداز سے آئینہ ہوتا ہے کہ وہ حیرت اور درد کی تکلیف سے ہم کنار کرجاتا ہے۔ تقسیم کے بعد عام انسانوں کی جو ترقیِ معلوس کی صورتِ حال سامنے آئی، اُسے بانی نے اپنے مخصوص و منفرد تخلیقی انداز میں پیش کیا ہے جو اُنھی کے خلاقانہ ذہن و فکر کا کرشمہ ہے اور پھر یہ کہ وہ تقسیم کے عمل کو نعرہ اور کلیہ بھی نہیں بننے دیتے۔اپنے تجربات و حوادث کو تخلیقی عمل سے گزارتے وقت بانی غزل کی ایمائیت کو بہ حال پیشِ نظر رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزل میں غزل کی چاشنی بھی برقرار رہتی ہے اور دُکھ کی کیفیت بھی اُن کے تخلیقی عمل سے دو لخت نہیں ہوتی یا دم توڑتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی، یہ اُن کی فنی ہنر مندی کا کمال کہا جا سکتا ہے۔ بانی کے کلام میں ہجرت کے ضمن میں چند اشعار جو اُن کی ایمائیت اور فنی ہُنر مندی پر دلالت کرتے ہیں، ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں:

بھرے شہر میں اِک بیاباں بھی تھا
اشارہ تھا اپنے ہی گھر کی طرف
مرے واسطے جانے کیا لائے گی
گئی ہے ہواِک کھنڈر کی طرف
کنارا ہی کٹنے کی سب دیر تھی
پھسلتے گئے ہم بھنور کی طرف
کوئی درمیاں سے نکلتا گیا
نہ دیکھا کسی ہم سفر کی طرف
رہی دل میں حسرت کہ بانی چلیں
کسی منزلِ پُر خطر کی طرف

بانی اپنا سب کچھ تومُلتان کی نذر کرگئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہانیادِملالِ وطن اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کیفیات اورمحسوسات کی جلوہ گری ہوئی ہے۔ یوں ناسٹیلجیا کاایک کرب ناک انداز اُن کے یہاں دیکھا اورمحسوس کیاجاسکتاہے۔ اپنے محبوب گھرسے بچھڑنے کاغم، ا س کی عزت کی پاس داری اور شہر یاروں کی شہریاری، ایسے عالم میں کون قابلِ بھروسہ ہوسکتاہے اور دوستوں کی دوستی بھی کہاں کام آسکتی ہے۔ اپنے احباب اورسنگی ساتھیوں سے بچھڑنے کا دُکھ اور ساتھ ہی ساتھ ہجرت اور اپنے اُس گھر کی یاد جو کھنڈر کا نقشہ پیش کر رہا ہے اور پھر یہ کہ جہاں سے اُسے ہجرت کرنا پڑی تھی۔ یہ ایک سماجی کرب ہے جو بانی کے ہاں انفرادی اور اجتماعی تجربے کے طورپر دردوکرب کی شدت کے ساتھ تخلیقی انداز میں جلوہ گرہوا ہے، اِس ضمن میں چند اشعارملاحظہ کیے جاسکتے ہیں:

مجھے بچھڑنے کا غم تو رہے گا ہم سفرو!
مگر سفر کا تقاضا جدا ہے میرے لیے
ڈھلے گی شام جہاں، کچھ نظر نہ آئے گا
پھر اُس کے بعد بہت یاد گھر کی آئے گی
نہ کوئی جا کے اُسے دُکھ مرے سنائے گا
نہ کام دوستی اب شہر بھر کی آئے گی

اِدھر سے اُدھر جانے کی کیفیت کوبانی نے اپنے ایک مقطع میں کس کرب والم کے ساتھ آئینہ کیاہے، اس دُکھ کی شدت کو ہر حساس انسان محسوس کیے بغیرنہیں رہ سکتا:

کچھ اور موڑ گزرنے کی دیر ہے بانی
صدا نہ گرد کسی ہم سفر کی آئے گی
اِک خواب تھا کہ لوٹ گیا خوں کے جسم میں
اب تند دھڑکنوں کے بھنور چن رہا ہوں میں

تقسیم کے نتیجے میں ہجرت میں انسانوں کی پامالی اور قتل وغارت کے ساتھ جو سانحہ رونما ہوا ، وہ لاکھوں انسانوں ،بے شمار گھروں، قریوں، مکانوں اورجائیدادوں سے محرومی کا دکھ تو ہے ہی اس کے ساتھ اپنے سے عدمِ وابستگی ہے۔ رشتوں ناتوں کا بچھڑنا اور انسانی جذبات کی توڑ پھوڑ نے اعصاب شل ہی نہیں کیے بلکہ سب کچھ ریزہ ریزہ کر دیا، سب کچھ بکھر کر رہ گیا۔ رشتوں ناتوں کابچھڑنا، اپنوں کی اپنوں سے جدائی اورگم شدگی،یہ اتنا بڑا المیہ تھا کہ بانی جیسے حساس شاعر نے اسے جس شدت سے محسوس کیا ، وہ تاعمر اُسے فراموش نہ کر سکا۔ ۱۹۸۱ء میں بانیکا جہانِ فانی سے دیہانت ہوا ۔ اس عرصہ تک اس کا یہ احساس اس کے تینوں شعری مجموعوں میں کہیں بہت شدید اور کہیں ایک زیریں اور دھیمے احساس کے طورپر نظرآتاہے۔ جہاں وہاں محض احساس ہے :

پرندے پہلی اُڑانوں کے بعد لوٹ آئے

لپک اُٹھا کوئی احساس رایگانی کا

اور جہاں احساس میں شدت کا عنصرشامل ہوتا ہے :

دکھا کے لمحۂ خالی کا عکسِ لا تفسیر
یہ مجھ میں کون ہے مجھ سے فرار کرتے ہوئے

کہتے ہوئے بانی خود اپنے اندر ایک تھرتھراہٹ سے گھبرا اُٹھتا ہے۔ ''لمحۂ خالی'' کے ''عکسِ لاتفسیر'' کی حکایت اسے اتنی طویل، گمبھیراورخوں چکاں دکھائی دیتی ہے کہ وہ اس کی کوئی تصریح و تعبیر کرنے سے قاصر ہے کہ دیوار کے اُس پار بھی اوردوسری سمت بھی ایک ہی جیسامنظر اس کی آنکھوں میں ہویدا ہونے لگتاہے۔ مراد یہ کہ دُھند ہی دُھند کی صورتِ حال ہے۔ دوسری جانب اسے کائناتی وسعتوں اوراس کے مظاہر سے بھی سابقہ ہے ۔ اس کی نظر اَن دیکھی دنیاؤں کی تلاش میں بھٹکنے لگتی ہے مگر:

کہاں تلاش کروں اب اُفق کہانی کا
نظر کے سامنے منظر ہے بے کرانی کا

جملۂ معترضہ کے طورپر کہ ممتاز نقاد شمس الرحمن فاروقی نے بانی کے اس شعر کو بیدل کے جہانِ معنی میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔[۵]

مگر میرے خیال میں بانی کا جہانِ فکر بیدل کے معنی سے بہت مختلف اور اپنے عصری تناظر میں ایک اورنمایاں ستارے کی طرح روشن ہے۔ بیدل نے اگر یہ بات کہی ہے کہ:

اے محیط حیرانی! ایں چہ بیکرانی ہاست؟

تواس میں ایک تحیر کی کیفیت ہے اوراس کی تحیر میں ایک ایسا فلسفہ ہے جو ازخود اپنے سوال کا جواب فراہم کرتاہے جب کہ بانی کے ہاں ''بیکرانی'' کادرجہ اس تحیر سے جڑکر بھی ایک ایسی حقیقت کو بے نقاب کرتاہے جس پر غالب نے کہا تھا :

کیاتنگ ہم ستم زدگاں کاجہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

اب بیدل کے مشاہدۂ بیکرانی کو دیکھاجائے تویہ بیکرانی غالب کے ہاں بس ایک ''بیضۂ مور'' سے زیادہ نہیں مگر بانی توایک دوسری کیفیت میں ہے۔ وہ زمین کے کرب کو بھی آسمان کی بیکرانی سے جڑاہوا دیکھتاہے اورزمین کے کرب میں گھلاملا احساس اسے مجبور کرتا ہے :

میں کیوں نہ ڈُوبتے منظر کے ساتھ ڈُوب ہی جاؤں!
یہ شام اور سمندر اُداس پانی کا

اس طرح اس کے اندر فرار کی ایک کیفیت بھی جمع ہونے لگتی ہے:

بس ایک زخم تھا دل میں جگہ بناتا ہوا
ہزار غم تھے مگر بھولتے بسرتے ہوئے

ہجرت کے زخم نے دل میں ایسی جگہ بنائی کہ بس اور پھر یہ کہ ہزاروں غم تھے جو مرورِ ایّام کے ساتھ یادوں سے دھیرے دھیرے محو ہوتے چلے گئے، باوجود اس کے تقسیم نے جو زخم لگایا تھا، وہ زخم دل میں گھر کر کے رہ گیا۔ایسے میں شاعر کو اپنے کھوجانے اور اپنی گمشدگی کااحساس بھی پوری شدت کے ساتھ ہوتا ہے، جس کا اندازہ بانی کے شعر سے بھی لگایاجاسکتاہے:

میں ترے بعد پھر اے گمشدگی!
خیمۂ گردِ سفر سے نکلا

بانی کے یہاں جمالیات اورمحبت سے مملویادیں بھی اپنی ایک ہلکی سی کسک کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ کسی گوشت پوست کے انسان کے ساتھ گزرے ہوئے چند لمحات کی پر چھائیاں اُس کے دُکھوں کی شدت میں کمی کا بھی احساس دلاتی ہیں۔ اس طرح کرب کی شدت میں قدرے کمی کی کیفیت

کا احساس بھی اپنی ایک جھلک دکھاتا ہوا محسوس ہوتاہے اور پھر یہ کہ انسان اپنی شناخت کی تلاش میں بھی تو محوِ سفر رہتا ہے، اُس کو گم شدگی کب گوارا ہے جو گم شدگی سے اپنی ذات کو کھوج نکالتا ہے، اُس کی کرب ناکی کی کیفیت اور احساس کو بھی وہی جان سکتا ہے۔ملال و رائگانی کا احساس اپنی جگہ جہانِ معنی سے بھرپور ہے۔ اس ضمن میں بانی کا جمالیاتی اور پاکیزہ اندازِ محبت بھی اُن کے مذکورہ تخلیقی انداز کی غمازی کرتا ہے اور پھر یہ کہ قنوطیت کی بجائے نہ صرف رجائیت کا پہلو ایک طرح کی مثبت فکر کو جنم دیتا ہے بلکہ اُن کے یہاں 'دُعا' کا استعارہ بھی معنی خیز ہے۔اس ضمن میں اُن کا یہ شعر ملاحظہ کیاجاسکتاہے:

تمام راستہ پُھولوں بھراہے میرے لیے
کہیں تو کوئی دُعا مانگتا ہے میرے لیے

شاعری کی روایت سے انسلاک کے نتیجے میں بھی محبت اورجمالیات کے جذبے اور احساسات سے سرشار اشعار اُس کے ہاں دیکھنے کو ملتے ہیں اور کہیں کہیں ایسا بھی محسوس ہوتاہے کہ وہ ہجرت کے نتیجے میں کسی بھر پور غم کی کیفیت سے دوچار ہوئے ہیں۔ ہجرومِلال اوررایگانی کی کیفیات اور احساسات بھی بانی کی شاعری میں بے مثل صورتِ حال کی غمازی کرتے ہیں، اس غم کی شدت میں بھی محبت کے کارن کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔اب شاعر محبت کے سفر میں بھی احتیاط کا دامن تھامنے کی جانب رواں دواں محسوس ہوتا دکھائی پڑتا ہے، وہ اس لیے کہ وہ کسی اور حادثے کو متحمل نہیں ہو سکتا۔ محبت میں وہ طاقت ہے جو مصائب و مسائل اور دُکھوں کا مداوا کر سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بانی کی فکر میں محبت کی وجہ سے نیا موڑ آتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

بانی ذرا سنبھل کے محبت کا موڑ کاٹ
اِک حادثہ میں بھی تاک میں ہو گا یہیں کہیں
غم نکلتا نہ کبھی سینے سے
اِک محبت کی نظر سے نکلا
ایک اِک قصۂ بے معنی کا
سلسلہ تیری نظر سے نکلا
یہ دن ڈھلے کس کا منتظر میں نیا نیا سا
یہ پَلتے خواب میرے اندر نئے نئے سے
خشک ہوا شام کی کہانی نئی نئی سی
پرانے غم پھر محبتوں بھر ےنئے نئے سے

بانی کے ہاں شاعرانہ فطرت کی بے ساختہ چہکار کابھی پتا چلتا ہے۔ اُن کے اشعار تلازماتی محاسن سے اپنا دائرہ مکمل کرتے ہیں اوران کے مصرعوں میں بہترین نثری ترتیب کی آئینہ داریکا احساس ہوتا ہے جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اُن کے خمیر میں فطرت نے شاعری بچپن ہی سے ودیعت کررکھی تھی۔ اُن کی شاعری میں بولتے ہوئے مصرعے چونکانے یاورطۂ حیرت میں مبتلا کرنے سے زیادہ اُن کے مضامین کے پُرتاثیر ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ غزلیات کی ردیفیں اُن کی فنی چابکدستی کا پتاتو دیتی ہیں مگر ندرت اور تازہ کاری کے عناصر بھی ایسا احساس دلاتے ہیں کہ یہ شاعر عہد آیندہ کا شاعر ہے جو تقسیم کے عہد سے بھی آگے گزرتے ہوئے اپنے رفتہ وآیندہ کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جس کے یہاں موضوعات استعاراتی وعلامتی پیرائے میں جلوہ گر ہوتے ہیں مگر تمام تر شاعرانہ ہنرمندی اور تازہ کاری کے لوازمات کے ساتھ منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ وہ علامات واستعارات، شعری تمثالوں اورامیجز کے باہمی تال میل سے اپنی شاعری کی فضااستوار کرتے ہوئے، بالکل جُداگانہ رنگ ڈھنگ اور اسالیب کے اچھوتے اور نادر اُسلوب کے حامل شاعر ہیں اور پھر یہ کہ وہ خوشبوؤں کو مجسم کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ شعر میں اپنا رنگ اور اپنے مخصوص انداز کی فضا کو کیسے تعمیر کرنا ہے۔ وہ اس ہنر کاری کے سبب الگ تھلگ فضاتخلیق کرنے

والے شاعر ہیں۔ ستم ظریفی زمانہ کہیے کہ بانی نے ہجرت کرکے جس فضا میں پرورش پائی، اس کے شعری خدوخال کو نیا ذائقہ ملا، وہاں سے بھی اسے عام قاری تک پہنچنے میں مشکلات کا سامنا رہا۔ بانی کیمجبوری و مقہوری اور اس کے نتیجے میں بے خبری، منفرد طرزِ اظہار اور تخلیقی ہنرمندی اتنی بلندواقع ہوئی تھی کہ اس کے ساتھ چلنے والوں نے بھی راستہ روکا اوروہ یہ کہنے پر مجبور ہوا:

مجھ سے اِک قدم پر بچھڑتا ہوا کون تھا
ساتھ میرے، مجھے کیا خبر، دوسرا کون تھا
تابہ منزل یہ بکھری ہوئی گردِ پاکس کی ہے
اے برابر قدم دوستو، وہ جُدا کون تھا
جانے کس خطرے نے نجش دی سب کو ہم سائیگی
ورنہ اک دوسرے سے یہاں آشنا کون تھا
پہلے کس کی نظر میں خزانے تھے اس پار کے
مثل میرے ،حدوں سے اُدھر دیکھتا کون تھا

اس ''کون تھا'' میں بانی نے جواشارے مرتب کیے ہیں، وہ خودبخود بہت سے واقعات پرمحیط ہیں اورصاف معلوم ہوتا ہے کہ کن حربوں سے اسے پورے منظرنامے میں الگ تھلگ کھڑا کر دیا گیا جب کہ اپنے مختلف آہنگ کے ساتھ تووہ یوں بھی سب سے الگ دکھائی دیتاہے۔ کوئی خوف و خطر ہی ہوتا ہے جو نا آشناؤں کو بھی آشنا اور ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے۔ اس غزل میں حوادثِ زمانہ کے کئی شیڈز اُبھرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور پھر یہ کہ وہی شیڈز آنکھوں سے اوجھل بھی تو ہو جاتے ہیں۔

بانی کے کلام میں انسانی نفسیات کی باریکیوں کوبھی محسوس کیاجاسکتاہے ، وہ انسانی نفسیات کی باریکیوں کا غواص بھی ہے اوراُس کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر بھی رکھتاہے۔ اُس کے یہاں اداسی کی کیفیات استعارے اورامیجری کے باہم یک جاہونے سے ایک ایسی فضا استوار ہوتی ہے جو خود کلامی کابھی احساس دلاتی ہے اور تنہائی، فراقِ محبوب کی صورتِ حال کو آئینہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے اندازِ جُداگانہ کی غماز بھی ہے۔ بانی محبت کے غیر مرئی احساس کو بھی کھونا نہیں چاہتے، وہ محبت کے گداز پن اور نرم نازک لمحے کو بھی محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ بانی کے یہاں بہت سارے ایسے مضامین ہیں، جن میں بَلا کی تہ داری ہے اور معنی کے کئی جہان پوشیدہ ہیں:

میں ڈر رہا ہوں ہوا میں کہیں بکھر ہی نہ جائے
یہ پُھول پُھول سا لمحہ تری نشانی کا
وہ ہنستے کھیلتے اِک لفظ کہ گیا بانی
مگر مرے لیے دفتر کھلا معانی کا
اے گل آوارگی! تیری مہک تاروں سے کھیلے
اے ندی! بہتارہے دائم ترا بے دار پانی
سبز نیلی دُھند میں ڈوبے پہاڑوں سے اُتری
کیا عجب منظر بہ منظر روشنی تھی داستانی

بانی کے یہاں روشنی کا استعارہ نہایت معنی آفریں ہے۔شام کا وقت ، سمندر کا اُداس پانی درحقیقت شاعر کی تنہائی اور اُداسی کی کیفیت کو اُجاگر کرتے ہیں جس سے وہ خودگزررہاہے اورمذکورہ احساس شاعر کا ذاتی احساس تو ہے ہی،یہ احساس اُس جیسے کتنے ہی حساس لوگوں کا بھی ہو سکتا ہے مگر ایسے احساسات کو تخلیقی پیرائے میں جلوہ گر کرنا، دراصل شاعر ہی کے معجز بیان قلم کی کرشمہ کاری کہاجائے تو غلط نہ ہوگا۔

راج نرائن راز کاکہنا ہے :

''بانی کی غزلوں میں سانس لینے والے معاشرے کا فرد مُذبذب ہے ۔ تشکیک میں مبتلا

ہے۔ غیریقینی حالت میں الجھاہوا ہے۔ وہ یاس میں بکھرتا اورآس میں اُبھرتا ہے۔ وہ اَنا کامارا ہے۔ وہ لاسمتیت کااحساس رکھتاہے لیکن بے حوصلہ نہیں ہوتا۔ وہ مایوسیوں میں منہ نہیں بسورتا۔ وہ متأسف تو ہوتا ہے ،ماتم نہیں کرتا۔ اس کے طنز میں تلخی اور تبسم میں تکلف ہے۔ ایک لیے دیے رہنے والی سنجیدگی اس کا خاصا ہے اوریہ تمام امور ایک سوچتے ہوئے ذہن کاسبب اورنتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ترنگوں میں نہیں بہتا۔ تن آسانی کو اپنا شعار نہیں بناتا۔ ذہنی فرار کی راہ نہیں لیتا۔ وہ تعقل سے جینے کا جواز ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ ہر حسن، ہر قبح کو اپنا حصہ سمجھتاہے۔ مختلف اورمتضاد رویوں میں ایک ربط پیدا کرلیتا ہے۔ بعض اوقات وہ ایسی سرد منطق سے کام لیتا ہے کہ اس کی ہوش مندی پر حیرت ہوتی ہے۔''(٦)

اگرچہ کہیں رجائی لہجے کے اشعار بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، مگر اس کا کریڈٹ وہ اپنے محبوب کی اس محبت کوتصور کرتے ہیں جو اس سے دلی اُنس اوراپنائیت کی وجہ سے پیدا ہوتاہے ۔ اس کا محبوب شاید اس کی شاعرانہ طبیعت سے کسی حدتک واقف ہے اوراس کے دوروکرب سے بھی آشنا ہے۔ اس ضمن میں یہ شعرملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

مری خوشی کا وہ کیا کیا خیال رکھتا ہے
کہ جیسے میری طبیعت سے آشنا ہے بہت

اس کے ہاں عہد آیندہ میں کسی سے ہم سفری کے اشارے بھی ملتے ہیں جو تشنہ ٔ تعبیر رہے مگر شاعراس کی بے ضررِدُعاؤں ہی کو اپنے لیے بہت کچھ خیال کرتاہے، یہ شاید ہجرت سے پہلے محبت کا تجربہ ہے جو ہجرت کے حقیقی تجربے کی نذہوگیا۔ اسے یہ بھی احساس ہے کہ وہ اُسے چھوڑ کر چلا گیا ہے اور خود کو ہی موردِ الزام بھی تصور کرتا ہے۔ اس حوالے سے ان کے یہ اشعار توجہ طلب ہیں:

بجائے ہم سفری اتنا رابطہ ہے بہت
کہ میرے حق میں تری بے ضرر دُعا ہے بہت
تمام عمر جنھیں ہم نے ٹوٹ کر چاہا
ہمارے ہاتھوں اُنھی پر ستم ہوا ہے بہت
کوئی کھڑا ہے مری طرح بھیڑ میں تنہا
نظر بچا کے مری سمت دیکھتا ہے بہت
وہٹوٹتے ہوئے رشتوں کا حسنِ آخر تھا
کہ چپ سی لگ گئی دونوں کو بات کرتے ہوئے

بانی کے کلام میں انسانی وجود کی پرتوں کو کھولنے والے اشعار جواُن کی باریک بینی اور قوتِ مشاہدہ کی غمنازی کرتے ہیں۔ جہاں انسان سمجھتا کچھ ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ انسان جس کو اپناہمدرد، مونس وغم خوار سمجھ رہا ہوتاہے مگر جب اس سے اُس کو سابقہ پڑتا ہے تو اُس کی اصلیت کھل کر سامنے آنا شروع ہو جاتی ہے اور محبت کا متلاشی انسان کفِ افسوس ملتا رہ جاتاہے۔ اس تناظر میں بانی نے جس انداز میں اپنی باریک بینی کا ثبوت دیا ہے، ملاحظہ ہو:

ذرا چھوا تھا کہ بس پیڑ آگرا مجھ پر
کہاں خبر تھی کہ اندر سے کھوکھلا ہے بہت
یہ احتیاط کدہ ہے کڑے اُصولوں کا
ذرا سے نقص پہ بانی یہاں سزا ہے بہت
اِک گلِ تر بھی شرر سے نکلا
بس کہ ہر کام ہنر سے نکلا

بانی کی غزلوں کی نئی زمینیں بھی نئی شعری فضا کو تشکیل وتعمیر کرتی دکھائی دیتی ہیں جو

اُس کے فنی پیکروں میں اُس کے شعری طلسم کی خبر دیتی ہیں۔ ان کے پاس شاعرانہ اعجاز کایہ بین ثبوت ہے کہ وہ ہر طرح کے موضوعات کواپنے مخصوص شعری آہنگ، رنگ اورڈھنگ میں پیش کرنے میں قُدرت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی الضمیر کے اظہار کے لیے نئی زمینیں تلاشتے ہیں۔ اُنھیں ہر نئی زمین میں نئے پھول کھلا نے کا ہنر آتاہے جو اُن کی شاعرانہ قادرالکلامی کامنہ بولتا ثبوت ہے۔ اس حوالے سے اُن کے ہاں ایک خاص طرح کی تہ داری کو بھی محسوس کی جاسکتا ہے۔ ان کے ہاں نئی سے نئی زمین کا محض تجربہ ہی نہیں، اس کے احساس کی گہرائی میں رچے بسے تجربے کا تخلیقی بہاؤ بھی صاف محسوس کیاجاسکتاہے۔

صد سوغات سکوں فردوس ستمبر آ
اے رنگوں کے موسم منظر منظر آ
مجھے پتا تھا کہ اِک دن تو لوٹ کے آئے گا
رُکا ہوا دہلیز پہ کیوں ہے، اندر آ
آدھے آدھے لمس نہ میرے ہاتھ پہ رکھ
کبھی سپردِ بدن سا مجھے میسر آ
لباس اُس کا علامت کی طرح تھا
بدن روشن عبارت کی طرح تھا
ادا موجِ تجسس کی طرح تھی
نفس، خوشبو کی شہرت کی طرح تھا
بساط رنگ تھی مٹھی میں اُس کی
قدم اُس کا بشارت کی طرح تھا

منچندا بانی کے موضوعات میں بہت بڑے تاریخی، تہذیبی و ثقافتی سانحے اور المیے کی طرف اشارے ملتے ہیں ۔ اُن کے یہاں ہجرت، مسافرت بڑے توانا استعارے کے طورپر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ وہ تجربہ ہے جس کو شاعری میں بانی نے پوری صداقت کے ساتھ خلق کیا ہے۔ وہ اپنے دُکھ کو مصنوعی انداز میں چھپانے کے قائل اس لیے بھی نہیں ہیں کہ وہ ایک سچےتخلیق کار کی حیثیت سے اشیا کے بطن میں غواصی کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے چہرے پر دوسرا چہرہ نہیں سجاسکتے بلکہ اُن کے دل پر جو گزرتی رہی، اُس کوپوری دیانت داری اور بھرپور شعریت کے ساتھ اپنی شاعری میں وہ آئینہ کرتے رہے، اُن کے یہاں محبت کے مضامین بھی ایک خاص طرح کی پاکیزگی کا احساس دلاتے ہیں، موضوعاتی سطح پر اُن کی غزل میں تنوع کا بھر پور احساس ہوتا ہے، جزیروں پر آبادی اور نفوس قیام پذیر ہوتے ہیں اور اگر اُنھیں پانیوں کی کاٹ لے ڈوبے تو زندگی کا معدوم ہو جانا سامنے کا مظہر ہے اور پھر یہ کہ پانی کی ایک موج کے بعد دوسری موج اس کو اپنی شناخت کو بھی عدمِ شناخت کا شکار کر دیتی ہے، اس طرح پانیوں کی امواج کا تسلسل جاری و ساری ہے جو زیست کو جنم بھی دیتا ہے اور معدوم کرنے کی بھی توانائی سے لبریز ہوتا ہے:

کن پانیوں کا زور اُسے کاٹ لے گیا
دیکھا تھا ہم نے ایک جزیرہ یہیں کہیں
منسوب جس سے ہو نہ سکا کوئی حادثہ
گم ہو کے رہ گیا ہے وہ لمحہ یہیں کہیں
آوارگی کا ڈر نہ کوئی ڈُوبنے کا خوف
صحرا ہی آس پاس نہ دریاہیں کہیں
عجیب تجربہ تھا بھیڑ سے گزرنے کا
اُسے بہانہ ملا مجھ سے بات کرنے کا
پھر ایک موج تہ آب اس کو کھینچ گئی

تماشا ختم ہُوا ڈُوبنے اُبھرنے کا

بانی کی شاعری میں انسانی رشتوں کے ٹوٹنے کی کیفیات بھی بالکل الگ تھلگ پیرایۂ اظہار کی حامل ہیں۔ اس کے تجربات کی نوعیت ہی مختلف ہے۔ اس کی تخلیقی کائنات نہ صرف بے کراں محسوس ہوتی ہے بلکہ افق تابہ افق وسعتوں کی حامل ہے، اس کے یہاں زمینی رشتوں کا بھی احساس ہوتا ہے اورکائنات میں آسمانی وسعتیں بھی مختلف انداز میں جلوہ گر ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ فرد کا تعلق زمین اور زمینی رشتوں سے توہے ہی مگر اُس میں اُڑان بھرنے کا جذبہ بھی تو پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ یہی موجود اور لاموجود کی وجدانی کیفیات کاادراک بانی کے کلام میں اپنی تابانیوں کے ساتھ محسوسات پر عجب انداز سے اپنے اثرات مرتب کرتا ہوا محسوسات کونئے جہانوں کی جانب لے جاتا ہے۔ اس کے یہاں پرندہ ایک ایسی علامت ہے جو کائنات کی لامحدودیت سے تعبیر وعبارت ہے۔ انسانی رشتوں کی توڑ پھوڑ بھی حساس دلوں پرعجب کیفیات مرتب کرتی ہے جو بانی کے یہاں چپ کھڑے ہونے، تعلق کے اختصار کی خبرتو دیتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ایک انسان کی سادگی اور معصومیت کی نہیں بلکہ فہم وفراست کی داستان کابھی پتا دیتی ہے۔ انسان آشنائی کے سفر میں تو سکوت توڑ دیتاہے۔ اگرکسی سے راہ ورسم ہی نہ ہو تووہاں دانش مندی سے کام لینے والا انسان سکوت اختیار کرلیتاہے۔ بانی کے یہاں ماضی کے ان لمحوں کویاد کرنے کی کیفیت کا احساس کچھ یوں ہے کہ جس سے کبھی رہ ورسم تھی ،وہ جب یاد آتاہے تواپنی التفات وعنایات سے بڑھ کر یاد آتاہے۔ جیساکہ بانی کے یہاں دیکھنے کوملتاہے۔

غزل ایسی صنفِ سخن ہے جو روایت سے اپنا دامن چھڑانا بھی چاہے تو چھڑانہیں سکتی مگر فطری شاعرکے لیے کسی ایک ہیئت کی قید کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ تواپنے ماضی الضمیر کے اظہار کے لیے خودہی اپنا راستہ بنالیتاہے۔ بانی کے ہاں ہیئت کی تبدیلی بھی ملتی ہے۔ اس نے صرف غزل نہیں کہی بلکہ نظم میں بھی دادِ سخن دی مگر یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اُس کی فکر کا بہاؤ نظم سے زیادہ غزل ہی میں نظر آتاہے ۔ اس ضمن میں خالد علیم کی رائے ہے :

> بانی کی نظم کواگر اس کی غزل میں موجود تخلیقی رویے کی مناسبت سے دیکھاجائے تو ہمیں ایک نمایاں فرق محسوس ہوتاہے۔ اس کی ایک وجہ ہیئت کا امتیاز بھی ہوسکتاہے، البتہ دوسری بڑی وجہ بانی کے اپنے موضوعات ہیں جو اُن کی نظموں کو اُن کے خاص آہنگ میں مشخص کرتے ہوئے نظم کی فکری اکائی میں ایک مربوط وارداتِ ذہنی و قلبی کے ساتھ تشکیل پاتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بانی کا اپنا خاص اندازِ نظر بھی موجود ہے ،فکری تنوع ، جو بانی کی خصوصیت ہے اور منفرد تخلیقی رویہ جوبانی کی پہچان ہے، ہمیں اُن کی نظموں میں بھی دکھائی دے جاتاہے، یوں اُن کا خاص تخلیقی مزاج اور اُن کا ذاتیالمیہ بھی اجتماعی آشوب کے آئینے میں غزل کے ایمائی اظہار کے مقابل زیادہ واضح ہے ، مگر بانی کی شاعرانہ پہچان کا معاملہ چوں کہ غزل ہی سے مربوط ہے، اس لیے ہمیں بانی کی نظموں کے عناصر میں وہ دل کی کشی محسوس نہیں ہوتی جو اُن کی غزل کی شاعری نے پیدا کی ۔ تاہم اگر بانی کی نظموں کو اُن کی غزلوں سے الگ کرکے دیکھا جائے تووہ ایک اہم نظم نگار شاعر کی حیثیت سے بھی اپنا اعتراف کروالیتے ہیں۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ یہ نظمیں بانی کی ہیں اوراُن کے عہد کی نظم نگاری کے اصل معیار کی آئینہ دار بھی۔ ''حرف معتبر'' اور ''حسابِ رنگ'' کی زیادہ تر چھوٹی چھوٹی لائنوں سے ترتیب پانے والی نظموں کو ملاکر دیکھا جائے توبانی یہاں بھی اپنے تخلیقی رویے کی بناپر اپنے ہم عصروں سے الگ کھڑے نظر آتے ہیں۔''(۷)

غزل اُن کی طبیعت کا جوہرِ خاص ہے اوراس میں وہ نئے سے نیا پیکر تراشنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں، وہ ہَواؤں کے لمس سے خوشبو کو نہ صرف کشید کرنے کا ہنر رکھتے ہیں بلکہ وہ مہک کو مشخص کرنے کی بھی تخلیقی قوت سے مالا مال ذہنِ رسا کے حامل تخلیق کار ہیں۔ اردو

شاعری میں ان کی غزل ایک معجزاتی علامت نگاری کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت ایک پوری داستان رقم کرنا یقیناً ایک معجزہ ہے اور بانی نے یہ کارنامہ کردکھایا ہے۔ یہاں ان کی مختلف غزلوں سے چند اشعار جن میں نفسیاتی باریکیوں کا احساس بھی ہوتا ہے، حوالۂ قلم کیے جاتے ہیں:

کہیں نہ آخری جھونکا ہو مٹتے رشتوں کا
یہ درمیاں سے نکلتا ہوا سا کچھ تو ہے
میں چپ کھڑا تھا تعلقات میں اختصار جو تھا
اسی نے بات بنائی وہ ہشیار جو تھا
اے دوست ! میں خاموش کسی ڈر سے نہیں تھا
قائل ہی تری بات کا اندر سے نہیں تھا
نہ جانے کل ہوں کہاں ساتھ اب ہوا کے ہیں
کہ ہم پرندے مقاماتِ گم شدہ کے ہیں
ڈھانپ دیا سارا آکاش پرندے نے
کیا دل کش منظر تھا پر پھیلانے کا
مرے بدن میں پگھلتا ہوا سا کچھ ہے
اِک اور ذات میں ڈھلتا ہوا سا کچھ ہے
بانی شکن شکن سا تمھارا دروں بھی ہے
کچھ پارہ پارہ سا ہے تمھارا لباس بھی
اِک بوند میرے خوں کی اُڑی تھی طرف طرف
اب سارے خاک داں میں چمک بھی ہے باس بھی
میں خلاؤں میں اُڑتا ورق تیرے اقرار کا ہوں
نقش جس پر ترے بوسۂ اولیں کا نشاں ہے
وہ خاک اُڑانے پہ آئے تو سارے دشت اُس کے
چلے گداز قدم تو چمن چمن اُس کا

کائنات کی وسعتوں کے لامحدود ہونے کا احساس بھی بانی کے یہاں اپنے جُداگانہ اندازِ نظر کا غمناز ہے اوراُنھیںیہ بھی معلوم ہے کہ انسان کے شعور میں وسعتوں سے نئے آفاق اور نئے منطقے دریافت ہوتے ہیں اورآنکھیں نئے منظروں سے آشنا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ وہ معنی آفرینی ومضمون آفرینی کے اعجاز اور طلسم سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ اپنے مفہوم اورمافی الضمیر کو ایسے انداز میں بیان کرنے پر قادر ہیں کہ اُن کے باطن کی توڑ پھوڑ کا بھی اندازہ لگایا جاسکتاہے اوراس کی ظاہر بینی کو بھی محسوس کیاجاسکتاہے۔ وہ لفظوں کی تکرار سے جن کیفیتونکی عکاسی کرتے ہیں، ان سے تو ہر عام آدمی گزرتا ہے مگر تخلیقی سطح پر بیان کرنا توبانی ہی کاکام تھا۔ بانی اپنے ڈھنگ میں مختلف الجہت نوعیت کے موضوع کواس انداز سے تخلیق کرتے ہیں کہ جس سے صاف معلوم ہوتاہے کہ اس شعر کا خالق بانی ہے۔ پاکستان میں معدودے چند اور بھارت میں بانی کی تقلید کرنے والے کئی شاعر پیدا ہوئے، یوں ہی جیسے منیر نیازی کے بارے میں ایک عام تصور ہے کہ ہندوستان میں بہت ابتدا میں ان کے شعری خدوخال اور معنی آفرینی کاچرچاتھا اوربہت سے لوگ ان سے متاثر بھی تھے۔ شہریار جیسے شاعروں نے منیرنیازی کی تقلید کی مگر یہ امر واقعی ہے کہ بانی کی شاعری کااثر بھی صاف دکھائی دیتاہے۔ بانی کے معاصرین میں جدید غزل میں منیرنیازی واحدشاعر ہے جوہندوستان میں اپنے پورے شعری وجود کے ساتھ سرایت کرچکے تھے۔ بانی کوکہاں اورکس جگہ سے ادھر اُدھر کیاگیا،یہ وہاں کے محققین اور تنقید نگار ہی بتاسکتے ہیں مگر جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، بانی نے اپنی غزل کے پورے رسوخ کے ساتھ وہاں کی شعری فضاپر اپناطلسم جمایا تھابانی کی نظم ''آخری بس'' درحقیقت

بے گانگی، اجنبیت اور مغائرت کی صورتِ حال جو تقسیم کے بعد پیدا ہو چکی تھی، اُسے آئینہ کرتی ہے، اس نظم کے رُموز و علائم سے پتا چلتا ہے کہ ایک طرف تو انسان ایک دوسرے سے بے گانہ ہوتے جا رہے ہیں تو دوسری جانب باہمی قُربتیں، دُوریوں میں ڈھلتی جا رہی ہیں۔ 'آخری بس' کو اجنبیت، بے گانگی اور مغائرت کا استعارہ کہا جا سکتا ہے۔ دُنیا میں ہر کوئی اپنی اپنی منزل کی جانب محوِ سفر تو ہے، لیکن سارے کے سارے ایک دوسرے سے نا آشنا اور اجنبی ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے 'آخری بس' کے مسافر ایک دوسرے سے نا آشنا اور ناواقف ہوتے ہیں اور پھر یہ کہ اجنبیت کا احساس بھی کسی کے بطن میں خوفِ تنہائی اور دُوری کے احساس کو فزوں تر محسوس نہیں ہونے دیتا مگر ایک حسّاس تخلیق کار کو تو اس کا بڑی شدّت کے ساتھ درد محسوس ہوتا ہے کہ اجنبیت اور دُوریاں بڑھ رہی ہیں۔ شاعر کے نزدیک ماضی کی سماجی صورتِ حال انسانی رشتوں کے تناظر میں زیادہ اپنائیت، محبت اور کوسموپولیٹن کلچر کی آئینہ دار محسوس ہوتی ہے، جہاں ہر مذہب کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف سماجی رشتوں کا لحاظ رکھتے تھے بلکہ ایک دوسرے سے محوِ کلام ہو کر طمانیتِ قلب کے ایک اٹوٹ بندھن میں منسلک تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ محوِ گفتگو ہو کر اپنے لیے راحت اور مسرت کا سامان کشید کرتے تھے۔ اب 'کوسموپولیٹن کلچر' ایسی مثبت فکر پر مبنی صورتِ حال بھی نشان زد ہو کر قصۂ پارینہ بن گئی ہے اور اُدھر مشترکہ کلچر کی پیشانی پر بھی سوالیہ نشان ثبت کر دیا گیا ہے۔شاعر نے سامنے کے منظر نامے کو ایک بڑے سوال کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ بڑا سوال کیا ہے؟ بڑا سوال یہ ہے کہ مغائرت بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے، اجنبیت اور مغائرت کے نتیجے میں انسانوں کے مابین سماجی رشتوں کی بے وقعتی حدوں کو چھو رہی ہے، یہاں تک کہ قُربتیں، دُوریوں میں متشکل ہو چکی ہیں۔ ''آخری بس'' کو بہت زیادہ ملفوف اور استعاراتی و علامتی انداز میں خلق کیا جا سکتا تھا، لیکن شاعر نے اپنے واضح پیغام کی ترسیل کے پیشِ نظر نظم کو بہت زیادہ پیچیدہ بنانے سے گریز کیا ہے اور مذکورہ نظم کے وسیلے سے بڑھتی ہوئی مادّیت پرستی کو نہ صرف اُجاگر کرنے کی کامیاب سعی کی ہے بلکہ عصرِ حاضر کے انسان کے ذہن و فکر میں اجنبیت اور مغائرت جیسے نہایت اہم سوال کی معدوم ہوتی ہوئی صورتِ حال کو آئینہ کیا ہے۔'' آج دُنیا بس کی طرح محوِ سفر ہے، سب مسافر، قُرب کے احساس سے نا آشنا بیٹھے ہوئے ہیں، اب کسی کو اجنبی ہونا بُرا لگتا نہیں ہے!''[۸] جہاں تک بانی کی غزل کی بات ہے تو بانی کی غزل کو ان معنی میں نئی غزل کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی غزل میں تغزل کی تمام و کمال جمالیات بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انفرادی اور باطنی محسوسات کی نازک پیکر تراشی کے علاوہ روحِ عصر بھی جُدا گانہ انداز میں تمام معنی آفرینی کے ساتھ اپنا معنیاتی دائرہ مکمل کرتی ہے۔بانی کی غزل میں جمالیات، محبت، رومانویت اور نیچر کی جمالیات کے کئی رنگ موجود ہیں۔غزل کا بنیادی اور وصفِ خاص تو اس کے ایمائی اظہار میں پوشیدہ ہے۔بانی کی غزل میں فکری گہرائی اور گیرائی کا بھی احساس ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فنی جمالیات کو بھی اُنھوں نےملحوظِ نظر رکھا ہے۔ تقسیم کا سانحہ ایک تاریخی حقیقت ہے، لیکن تقسیم کے بعد جس طریقے سے خوابوں کو تعبیریں میسر نہ آ سکیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ تقسیم کے بعد شرنارتھیوں اور مہاجرین کے خواب چکنا چُور ہو گئے جس کے نتیجے میں عدمِ شناخت کی صورتِ حال نے بھی جنم لیا اور اجنبیت و مغائرت بھی بڑھ گئی۔ شناخت کا سوال ایک ایسا اہم سوال ہے کہ جس نے بانی کی غزل کے ذریعے اظہار کی صورت اختیار کی۔ تقسیم کے بعد مغائرت، بے گانگی، اجنبیت، شناخت کی تلاش ایک انتہائی اہم سوال تھا، جس نے انسان کے خوابوں کی توڑ پھوڑ کے ساتھ غم و اندوہ کی صورتِ حال کو جنم دیا اور داخلی سطح پر ایک لحاظ پژمردگی کی کیفیت پیدا کی، ظاہر ہے کہ بانی بھی اسی طرح کی کیفیت سے نبرد آزما رہے۔تنہائی، احساسِ تنہائی، مغائرت، احساسِ اجنبیت اور احساسِ بے گانگی ایسی کیفیت اور صورتِ احوال نے بانی کی غزل میں اظہار کی راہ پائی۔ اُن کی غزل میں کئی لحاظ سے سماجی رشتوں کی شکست و ریخت اور 'کوسموپولیٹن' کلچر میں جس طریقے سے انتشار اور زوال کے عناصر نے جنم لیا، مذکورہ عناصر و عوامل نے بھی بانی کی غزل میں ظہور کیا۔ سُریندر پرکاش، بلراج

مین را، کمار پاشی، جتیندر بلّو اور دیوندر ستیارتھی کی نثر میں بھی مغائرت، بے گانگی اور اجنبیت کی صورتِ حال آئینہ ہوئی ہے۔تقسیم سے قبل جو 'کوسموپولیٹن کلچر' کی ایک مثبت صورتِ حال تھی، جس میں تمام مذاہب خاص طور سے مسلم ، ہندو اکٹھے رہتے تھے، تقسیم کے بعد مذکورہ صورتِ حال کو بھی شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑا، جس نے حسّاس تخلیق کاروں کے خوابوں کو چکنا چُور کرکے رکھ دیا اور پھر یہ کہ بے روزگاری، بے گھری، اجنبیت اور شناخت کے سوال نے مزید کئی سوالات کو جنم دیا اور اُن سوالات نے تخلیقی سطح پر بانی کے کلام میں راہِ اظہار کو تلاش کیا۔ اس طرح اپنائیت کے برعکس اجنبیت، بے گانگی اور مغائرت ایسی باطنی اور خارجی صورتِ حال کے نتیجے میں اکیلا پن اور دُوری جیسے موضوعات نے اظہار کے نئے سانچے بنا کر بانی کو با اندازِ دِگر اپنے مافی الضمیر پر مائل کیا۔صنعتی انقلاب کے دُور رس اور منفی اثرات نے بھی مغائرت اور اجنبیت کو ہَوا دی اور اس لیے کہ مشینوں نے مادّیت کی فکر کو پروان چڑھایا اور نتیجتاً خوفِ تنہائی فزوں تر ہو گیا، توڑ پھوڑ اور ذہنی و فکری انتشار و خلفشار نے متعدد سطحوں پر سماجی رشتوں میں فاصلے فزوں تر کر دیے۔ اس طرح کی کیفیات، احساسات اور صورتِ حال نے بھی بانی کی غزل میں ظہور کیا۔مذکورہ اظہار نئی غزل کے روپ میں منصۂ شہود پر آیا۔بانی کا قرینۂ اظہار اپنے معاصرین سے نہ صرف جُدا گانہ نوعیت کا حامل و آئینہ دار ہے بلکہ اُن کی شعری حسّیت بھی الگ نوعیت کی حامل و آئینہ ہے۔اسی طرح اُن کی مصرع سازی، تلازمات، تراکیب سازی اور دو مصرعوں کو تلازمہ کے ذریعے باہم منسلک کرنے کا تخلیقی زاویہ بھی معاصرین سے الگ تھلگ نوعیت کا حامل ہے۔ منچندا بانی کے یہاں روایت اور عصری زندگی کے مضامین کا ایک خوب صورت اور تخلیقی امتزاج اُن کی غزل کو دو آتشہ کر دیتا ہے۔ اُن کی غزل میں فطرت کے ساتھ تعلقِ خاطر اور کئی لحاظ سے دلکش انسلاک قاری کو نہ صرف اپنی جانب راغب کرتا ہے بلکہ فرد کی تنہائی، احساسِ بے چارگی، خوفِ تنہائی، اقدار و روایات کی شکست و ریخت اور پھر یہ کہ جمالیاتی احساس بھی ہے اور اس کے ساتھ معاشرتی صورتِ حال کا بھی بڑے سلیقے اور قرینے کے ساتھ ایمائی سطح پر اظہار ہُوا ہے۔ روایت کے ساتھ جُڑت کے ضمن میں بانی کے یہاں رمز و اشاریت کے ساتھ اظہار بھی ہوا ہے:

تُو بھی زنجیر بہ زنجیر بڑھا ہے مری سمت
ساتھ میرے بھی روایت ہے نیا میں کیا ہوں!
ابھی ہونا ہے مجھے اور کہیں جا کے طلوع
ڈوبتے مہر کے ہمراہ بُجھا میں کیا ہوں!

اور میر تقی میر نے بھی تو کہا ہے:

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

رُخ ہَوا کا کوئی جب پُوچھتا اُس سے بانی
مُٹھی بھر خاک خَلا میں وہ اُڑا دیتا تھا

اب میر تقی میر صاحب کا بھی ایک شعر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مُشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

شناخت اور وُجودی احساس ایک ایسا سوال ہے جو بانی کی غزل میں نیا پن اور ملال بھی پیدا کرتا ہے اور پھر یہ کہ مادیت پرستی نے جس طریقے سے انسانی رشتوں کی شکست و ریخت کی ہے، بانی مذکورہ صورتِ حال کو بھی نشان زد کرتے ہیں۔وُجودی احساس، شناخت اور عدمِ شناخت ، مغائرت، بے گانگی، اجنبیت، خوفِ تنہائی، احساسِ شکست و ریخت، ایسے فکری عناصر و عوامل ہیں جو ایک حساس تخلیق کار کو تشکیک و تردید کے دوراہے پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ تقسیم کے بعد بانی کی غزل میں مغائرت، اجنبیت، خوفِ تنہائی، بے گانگی ایسے سوالات نہ صرف تشکیک و تردید کی فکر کو جنم

دیتے ہیں بلکہ روایتی طرزِ زیست اور طریقۂ کار کو بھی ٹوٹتا ہوا محسوس کرواتے ہیں۔مادّیت اور مادّی صورتِ حال نے جس طریقے سے پرانی اقدار و روایات کی جگہ لینا شروع کی تھی، اُن کی غزل میں اس کی بھی پیکر تراشی قاری کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کرتی ہے۔ بانی کی غزل میں گھر 'وطن' کے استعارے کی صورت میں اُبھرتا ہے، ایک ایسا وطن جو بے گانگی، مغائرت اور اجنبیت کے احساس کو فزوں تر کر دیتا ہے، جہاں بے یار و مددگاری کی صورتِ حال کے سِوا کیا ہے!

کوئی بھی گھر میں سمجھتا نہ تھا مرے دُکھ سُکھ
اِک اجنبی کی طرح میں خود اپنے گھر میں تھا
بھرے شہر میں اِک بیاباں بھی تھا
اشارہ تھا اپنے ہی گھر کی طرف

بانی کی غزل میں جو احساسِ لطافت ہے، وہ بہت ہی منفرد ہے اور اُن کے یہاں معرفت کے اشعار کا بھی احساس ہوتا ہے۔ معرفت کے ضمن میں یہ دو اشعار ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں:

تمام راستہ پھولوں بھرا ہے میرے لیے
کہیں تو کوئی دُعا مانگتا ہے میرے لیے
تمام شہر ہے دُشمن تو کیا ہے میرے لیے
میں جانتا ہوں تِرا دَر کُھلا ہے میرے لیے

میرا تخلیق کا معیار اور تخلیقی سفر دوسروں سے نہ صرف الگ تھلگ ہے بلکہ وہ مفاہمت پسندی کا قائل نہیں ہے، اُس کی اپنی راہ ہے اور اپنی ہی تحریک ہے۔یہاں مسرت سے بھر پور مغائرت ہے،وہ اپنے لیے ایک اور طرح کے راستے کو نہ صرف منتخب کر چکا ہے بلکہ وہ اس راستے پر چل بھی رہا ہے۔ وہ گِھسے پٹے راستے سے ہٹ کر اپنے لیے ایک اور راستے کا انتخاب کیے ہوئے ہے،یہ راستہ شاید کسی اور نے چُنا ہے، یہاں بھی روحانی فضا کا احساس ہوتا ہے۔

مجھے بِچھڑنے کا غم تو رہے گا ہم سفرو!
مگر سفر کا تقاضا جُدا ہے میرے لیے
وہ ایک عکس کہ پَل بھر نظر میں ٹھہرا تھا
تمام عمر کا اب سلسلہ ہے میرے لیے

محولہ بالا شعر میں بھی تصوف کا ایک حوالہ موجود ہے جو مِسٹِک وژن ہے جو تجلی یا جلوہ ہے ، وہ ایک صوفی کو بھی ایک ہی دفعہ نظر آتا ہے، شاعر کا وِژن اُس کی تخلیق میں نکھار پیدا کرتا ہے، اُسے تحریک دیتا ہے، وہ وِژن ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ وِژن عمر بھر اور پھر تسلسل کے ساتھ اُسے تحریک فراہم کرتا رہتا ہے، یہ اُس کا شعری فلسفہ ، شعری وژن اور شعری تحریک ہے جو عطیۂ خُدا وندی ہے، اُس کا جلوہ روحانی ہے، خُدائی جلوہ ہے، وہ ایک صوفیانہ اور روحانی و باطنی تجربہ ہے جو ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ روحانی تجربہ ہمیشہ اُس کی جمالیاتی اور 'اِنٹیلیکچوئلی' سطح پر رہنمائی بھی کرتا رہتا ہے۔عکس تو کسی وُجود کا دیکھا جاتا ہے اور پھر وہ عکس کسی آنکھ میں دیکھا جاتا ہے یا آئینے میں یا پانی میں عکس دیکھتے ہیں اور پھر دُنیا خود بھی تو خُدائی کا عکس ہے۔روحانی فلسفہ تو اسی جانب لے جاتا ہے۔

عجیب در گُزری کا شکار ہوں اب تک
کوئی کرم ہے نہ کوئی سزا ہے میرے لیے

اب یہاں شاعر نے 'در گُزری' کا لفظ کیا ہی ملفوف انداز میں استعمال کیا ہے۔'در گزر' کا لفظ ویسے تو برداشت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، نظر انداز کر دینے کے معنی میں، چھوڑ دینے کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، اب یہ نظر انداز کر دینا کہاں سے ہے! یہ نظر اندازی ایک تو سامنے کی سطح پر دُنیا کے حوالے سے ہے۔دُنیا نے نظر انداز کر دیا ہے، چھوڑ دیا ہے، لیکن مجموعی طور پر نہ تو کرم ہے، نہ سزا ہے، تو پھر ہے کیا؟ سفر ہے، یعنی جو تجربہ ہے، وہ مکمل نہیں ہے، اُسے

مزید صیقل کرنے کی ضرورت ہے، روحانی سطح پر مزید سفر کی ضرورت ہے، اس راہ پر مزید چلنے کی ضرورت ہے، سزا و جزا کا وقت بھی تو اُس وقت آتا ہے، جب کوئی پختہ و بالغ ہو جاتا ہے۔اس راہ گزر پر ابھی ابتدائی قدم پڑے ہیں۔مزید آبلہ ہونا ہے پھر جا کر سزا و جزا کا تعین ہوگا۔

گُزر سکوں گا نہ اس خواب خواب بستی سے
یہاں کی مٹّی بھی زنجیرِ پا ہے میرے لیے

اب اس شعر کی ایک سطح تو اُس کا سامنے کا تجربہ بھی ہو سکتا ہے، وہ جو اپنی دھرتی چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کی ہے، وہ مٹّی اب خواب کی صورت باقی رہ گئی ہے، اب اُس کا ظاہری، مشخص وجود تو نہیں ہے، وہ اب محض خواب کی صورت ہی بچی ہے، وہ مٹّی اُس کی یاد داشت میں محفوظ ہے، خواب خواب صورت اُس وقت ہوتی ہے، جب انسان ٹکڑوں میں فلیشز میں ، یا جب شاعر کو تحریک میسر آتی ہے تو وہ بلِنک کرتی ہے یا جس طرح کبھی کبھی بادل چمکتا ہے، اُس کا تخمینہ نہیں لگایا جا سکتا، اس کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی، وہ بلنکِگ میں شاعر کو کچھ نظر آتا ہے، شاعر کو کچھ ادراک ہوتا ہے، اُسے کچھ نظر پڑتا ہے۔

اب آپ جاؤں تو جا کر اُسے سمیٹوں میں
تمام سلسلہ بکھرا پڑا ہے میرے لیے
یہ حُسنِ ختمِ سفر یہ طِلسم خانۂ رنگ
کہ آنکھ جھپکوں تو منظر نیا ہے میرے لیے
یہ کیسے کوہ کے اندر میں دفن تھا بانی
وہ ابر بن کے برستا رہا ہے میرے لیے

یہ کاروبارِ زمانہ ہے ہی حضرتِ انسان کے لیے، انسان ہی اس کائنات کا مرکزہ ہے۔یہی نشاۃِ ثانیہ کا بنیادی فلسفہ تھا۔اب وہ اپنے جسمانی سفر کے خاتمے کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ابھی اُس کا وُجود ختم نہیں ہوا، شاعر نے پہلے مصرع میں جو تصور پیش کیا ہے، اب اُسے شاعر نے آفاقیت کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ اب یہاں حیاتِ آفاقی کی جانب اشارہ ہے، جسے حیات کے بعد کا فلسفہ کہا جاتا ہے، موت تو اس میں بھی نہیں ہے۔موت کا تو ہم نے تصور کیا ہوا ہے،موت کا تو کوئی وجود نہیں ہے، موت کیا ایک اور دُنیا کی جانب سفر ہےجو ابدی اور لامحدود ہے اور اگر کوئی ابدی کائنات ہے تو اس میں انسان کا وُجود بھی ابدی ہے اور اگر انسان کا وُجود ابدی ہے تو پھر انسانی وُجود کے معنی کیا ہیں؟ یہ شعر نشاۃِ ثانیہ کے فلسفے کے ساتھ بھی منسلک کرکے دیکھا جا سکتا ہے، اسے مذہبی تصور کے ساتھ منسلک کرکے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کاروبارِ زمانہ تخلیق ہی انسان کے لیے کیا گیا ہے۔ انسان اس کائنات کا مرکزہ ہے اور ’سمیٹوں میں‘ جو اشیا بکھری ہوئی ہیں، وسیع ترین دائرے میں بکھرئی چیزوں کو سمیٹنا، سمیٹنا کیا ہے؟ چیزوں کو ترتیب میں لے کر آنا۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ترتیب کون سی ہوگی، وہ ترتیب آفاقی ہوگی۔اب وہ ترتیب لگائے گا کون؟ وہ ’میں‘ ترتیب لگاؤں گا۔میں کون ہوں؟ میں انسان ہوں۔ میں اُسے کس بنیاد پر ترتیب لگاؤں گا۔ میں اُسے اپنی عقل کی بنیاد پر ترتیب دوں گا اور اُسے اپنے روحانی وُجود سے مکمل ترتیب لگاؤں گا۔شاعر کو وِجدان نصیب ہوتا ہے، جس کے اشارے بھی ملتے ہیں۔آگے چل کر وحدانیت سے جُڑنے کی جانب اشارہ ہے۔ میر تقی میر نے کہا ہے:

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
یہ حُسنِ ختمِ سفر، یہ طلسم خانۂ رنگ
کہ آنکھ جھپکوں تو منظر نیا ہے میرے لیے
یہ کیسے کوہ کے اندر میں دفن تھا بانی
وہ ابر بن کے برستا رہا ہے میرے لیے

’روح‘ اپنی لطافت کے اعتبار سے اُوپر کو اُٹھتی ہے، مادّی وجود بھی اللہ نے ہی بنایا ہے اور

اُوپر کون ہے؟ اُوپر خُدا ہے۔خُدا کے ساتھ جو چیز وابستہ ہو جائے گی، اُسے 'فنا' نہیں ہے۔فرشتوں کو فنا نہیں ہے۔ انسان کو بھی فنا نہیں ہے۔یہ جو موت کا تصور ہم نے قائم کیا ہوا ہے، وہ مادّی وُجود کے فنا ہو جانے کا نام ہے۔'روح' کو فنا ہے ہی نہیں، روح تو مادے کا جوہر ہے، وہ 'روح' اس لیے کہ وہ خدا سے جوڑنے کا ذریعہ ہے۔ہر مذہب میں جسم کی نفی ہے اور روح کو تقدم حاصل ہے کیوں کہ جسم فانی بھی ہے اور جسم میں وہ وصف ہی نہیں ہے جو انسان کو آفاقی ہستی کے ساتھ جوڑ سکے۔جسم محض ایک ظاہری وجود ہے اور وہ جو باطنی جوہر ہے، وہ ہے اصل اور کائناتی و آفاقی جوہر ہے اور اُسے موت نہیں ہے، فنا نہیں۔ خالقِ کائنات موت و حیات کے تصور سے ماورا ہے۔'روح' تو پروگریمنگ ہے، پروگرام کبھی نہیں مرتا، پروگرام کو کسی بھی وقت 'ایکٹیویٹ' کر سکتے تھے۔پروگریمنگ ختم نہیں ہو سکتی۔بانی کی تراکیب کا جمالیاتی آہنگ بھی انتہائی خوب صورت اور متاثر کُن ہے۔جیسے 'حسنِ ختمِ سفر' اور 'طلسم خانۂ رنگ' کی تراکیب ہیں۔فزیکل ورلڈ سے میٹا فزیکل کی طرف منتقلی بھی کیا عمدہ ہے۔بانی کا شاعرانہ حسن، خیال ، معنی آفرینی اور منظر نگاری و پیکر تراشی کیا ہی عمدہ ہے۔مقطع میں بھی روحانیت کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔'کوہ' کیا ہے؟ وہ وُجود ہے۔ 'کوہ' تو انسانی جسم ہے اور وہ 'برسنا' تو نور کا برسنا ہے، یہ جسم اور روح کی کہانی ہے۔کوہ تو ایک شیل ہے جو ایک پیغام ہے، کوہ ٹوٹے گا تو انسان باہر کی دُنیا سے آشنا ہوگا، جب شیل ٹوٹے گا تو انسانی باطن باہر سے یا اپنے جوہر سے آشنا ہوگا اور پھر انسان مکمل ہوگا،انسان اپنی تکمیل کے لیے متعدد ذرائع اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ہر ذریعہ ایک جانب چل کر، کچھ مدت تک چل کر اُسے طمانیت، تکمیل اور آسودگی کا غلط تاثر دیتا ہے، لیکن انسان کا باطنی جوہر بے کل اور مضطرب رہتا ہے، وہ مطمئن نہیں ہوتا، وہ اُس وقت مطمئن ہوتا ہے جب وہ اصل جوہر کے ساتھ جس کا وہ ایک حصہ ہے، اُس کے ساتھ جاکر ملتا ہے اور وہ جسے ہم موت کہتے ہیں، اُسی کے بعد ممکن ہے۔جب 'روح' جسم سے آزاد ہو جاتی ہے، پھر وہ اوپر کو اُٹھتی ہے اور پھر 'روح' اُس جہان سے جا کر ملتی ہے، جہاں سے وہ آکر انسانی وُجود کا حصہ بنائی گئی تھی۔[۹] بانی کے اولین شعری مجموعہ ''حرفِ معتبر'' میں تازہ کاری، ندرت اور جدت حیرت سے ہم کنار کرتی ہے۔اُن کی غزل میں نہ صرف ''آبِ رواں'' کی طرح جُدا گانہ طرزِ احساس ، مصرع سازی، منفرد شعری فضا کا احساس ہوتا ہے بلکہ وہ 'طرزِ بیدل ' میں اُردو غزل کہنے پر قادر نظر آتے ہیں۔ نئی تراکیب سازی اُن کا اختصاص کہا جائے تو کچھ مبالغہ بھی نہیں ہوگا، اُن کی تراکیب سازی میں بھی تازہ کاری، ندرت اور جدت کا پتا چلتا ہے جو نئے غزل گو شعرا کا اختصاص کم کم نظر آتا ہے۔بانی کے کلام میں علائم و رموز کا قرینہ اور استعاراتی نظام کئی لحاظ سے سحر طاری کر دینے کی توانائی سے بھر پور ہے۔اپنے تخلیقی اظہار کے لیے وہ موزوں ترین الفاظ کے لیے پتّا پانی کرتے ہیں، یہ وہ عنصر ہے جو اُن کے معاصرین کے حصے میں کم ہی دیکھنے کو میسر آتا ہے۔اُن کے یہاں الفاظ و تراکیب کا صوتی تاثر ایک خاص طرح کی جمالیاتی فضا کو تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ طلسمی کیفیت طاری کر کے قاری کو اپنے جانب کھینچتا ہے۔اُن کی تمثالیں اور پیکر تراشی و پیکر سازی بھی اُن کے کلام میں تہ داری پیدا کرتے ہیں، اُن کے یہاں ٹھوس اور سیّال ہر طرح کے امیجز شعر کو تہ دار بناتے ہیں۔ 'سوشل ڈِسلوکیشن' کے نتیجے میں کئی لحاظ سے نفسیاتی شکست و ریخت نے بھی اُن کے کلام میں جگہ پائی ہے ظاہر ہے جو ہجرت کا براہِ راست نتیجہ ہے۔بانی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نئے جہانِ معنی پیدا کرتے ہیں۔اُنھوں نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے نہ صرف نئے اسالیب وضع کیے بلکہ وہ اپنی اختراعات میں کامیاب بھی ہیں۔اُنھوں نے اپنے حسی تجربات اور قلبی واردات کو نئی زبان اور نیا آہنگ عطا کیا، یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار میں معانی و مفاہیم کے بے پناہ امکانات پوشیدہ ہیں۔اُنھوں نے اپنے ڈِکشن کو اس قرینے اور ہنر مندی سے برتا ہے کہ اُن کا اندازِ کلام بھی نیا نیا سا ہے اور اُن کی غزل میں نئے معنی بھی دیگر شعرا سے ہٹ کر محسوس ہوتے ہیں۔ بسا اوقات بانی کی غزل کا پروٹیگنسٹ واحد متکلم کی شکل میں اپنے لیے الگ تھلگ راستے کا انتخاب کرکے خود کو ہجوم سے جُدا کرنے کی تخلیقی توانائی سے لبریز ہے۔اس طرح وہ کائناتی بسط و کشاد کے متنوع رنگوں

میں نہ صرف اپنے وجودی احساس کو نامیاتی شکل میں تلاش کر لیتے ہیں بلکہ اپنے لیے ایک نیا جہانِ معنی بھی پیدا کر لیتے ہیں جو اُن کی الگ تھلگ اُڑان اور پہچان کی غمازی کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نارنگ، گوپی چند: **ادبی تنقید اور اسلوبیات** ،دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ، ۱۹۸۹ء، ص۲۳۰
۲۔ اس ضمن میں'**کلیات بانی**' ، راجیندر منچندا بانی، مطبوعہ، لاہور: ادارہ تحقیقاتِ ادب، سالِ اشاعت جون ۲۰۱۸ء ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔
۳۔ نارنگ، گوپی چند: **ادبی تنقید اور اسلوبیات**، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء ص ۲۵٦
۴۔ ماہ نامہ **فانوس** (بانی نمبر) ، شمارہ اگست ۲۰۱۵ء ، مشمولہ مضمون '' راجیندر منچندابانی: ہجرت کا دُکھ اور رجائیت کا استعارہ '' از ڈاکٹر شمیم حنفی ، ص ۱۳
۵۔ فاروقی، شمس الرحمن: **اثبات ونفی**، نئی دہلی ، مکتبہ جامعہ، ۲۰۱۱، ص ۲۱۲
٦۔ بانی، راجیندر منچندا،**حرف معتبر**، دہلی: مکتبہ تحریک، ص ۹
۷۔ ماہ نامہ **فانوس** (بانی نمبر) ،شمارہ اگست ۲۰۱۵، ص ۱۳۹
۸۔ بانی، راجیندر منچندا، **حرفِ معتبر**، لاہور: ادارہ تحقیقاتِ ادب، ۲۰۱۸ء، ص ۲۵۲
۹۔ بانی، راجیندر منچندا، **حرفِ معتبر**، لاہور: ادارہ تحقیقاتِ ادب، ۲۰۱۸ء، ص ۲۲۵، ۲۲٦